جامع الصّفات انسان

سید عطاء اللہ شاہ بخاری بلاشبہ ایک جامع الصفات انسان تھے۔ قدرت نے انہیں دل و دماغ کی بے شمار خوبیوں سے نوازا تھا۔ انسان الفاظ کے استعمال میں عموماً فیاض ہوتا ہے۔ مدح ہو یا قدح۔ قلم و زبان اکثر بے روک ہو کر چلتے ہیں لیکن شاہ جی کا معاملہ یہ تھا کہ کمالات و محاسن کے جتنے الفاظ بھی فراہم ہو سکتے ہیں انہیں ترازو کے ایک پلڑے میں رکھیں اور دوسرے پلڑے میں شاہ جی کے حسن و خوبی کا سرمایہ ہو تو یقیناً دوسرا پلڑا ہی جھکے گا۔ شاہ جی ایک خاص سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ یہ سانچہ اب ٹوٹ چکا ہے۔ اور اس عہد کے لوگ بھی رفتہ رفتہ اٹھتے چلے جاتے ہیں۔

اس بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ شخصیتیں ہی تہذیبی و معاشی حالات کے تقاضوں اور ضرورتوں کا مظہر ہوتی ہیں۔ ان کا وجود عوام سے کہیں بلند ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ عوام کی پیروی کے لئے نہیں عوام کے رہنمائی کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ اور زمانہ سے ماورئ نہ ہو کر بھی اس سے مستثنیٰ ضرور ہوتے ہیں۔ شاہ جی فکر و نظر اور جہد و عمل کے ایک خاص عہد کی پیداوار تھے۔ اس عہد نے واقعتہً ہماری قومی صفوں میں بڑے بڑے آدمی پیدا کئے۔ شاہ جی گویا اس محفل کا آخری چراغ تھے۔ ایک دو نشانیاں اور ہوں گی لیکن وہ بھی مہمانِ لفس یک دو نفس ہیں۔

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں!

یہ لوگ جس زمانے میں اپنے بلند آہنگ حوصلوں کے ساتھ سامنے آئے تھے جب تک ہمارے سامنے اس دور کی صحیح تصویر نہ ہو اس وقت تک ہم اس مٹی کے محاسن کا اندازہ ہی نہیں کر پاتے جس مٹی سے ان لوگوں کے پیکر تیار ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ماضی اپنی خاص روایتوں کے ساتھ گور کنارے آچکا تھا اور اس کے روبرو ایک نیا دور اپنی تمام شدتوں کے ساتھ نشو و نما پا رہا تھا۔ جہاں تہاں برطانوی سامراج کے خلاف خیالات بڑی تیزی سے کروٹیں لے رہے تھے دماغوں میں بہمہ وجوہ احتجاج موجود تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے نتائج نے اس احتجاج کا راستہ صاف کر دیا۔ پورے ملک کی خواہش آزادی رولٹ ایکٹ، جلیانوالہ باغ اور تحریک خلافت کے داخلی و خارجی اثرات کے تحت ایک مرکز پر آگئی اس مرکز نے رہنمائی اور اس کے مظاہر کا ایک نیا قافلہ پیدا کیا شاہ جی اسی قافلے کے ممتاز حدی خوانوں میں سرفہرست تھے۔ ادھر غور کرنے سے یہ عجیب و غریب بات کھلتی ہے کہ جو لوگ اس قافلہ میں شرک تھے وہ کسی تنہا خوبی ہی میں منفرد نہیں تھے۔ بلکہ ان کی ذات بہت سی خوبیوں کا مجموعہ تھی۔ احوال کی رفتار کا یہ عالم تھا کہ زندگی کا ہر گوشہ تبدیلیوں سے متاثر ہو رہا تھا۔ نہ صرف دنیا نے ایک نیا سانچہ قبول کر لیا بلکہ فکر و نظر کے سبھی دوائر ایک نیا روپ اختیار کر رہے تھے۔ شاہ جی معناً ان علماء و صلحاء کے وارث تھے جنہوں نے اسلام کی اساس پر انگریزوں کی بیخ کنی کا عہد کیا تھا۔ اور دیوبند کا مدرسہ جن کے امتیازی معتقدات کی علامت تھا۔ اس ذہن کی تعمیر میں بہت سے عوامل کا

ہاتھ کار فرما رہا۔ اب جو قومی اجتماع کی اجتماعی روح عدم تشدد کے طریق اور عدم تعاون کی تکنیک سے پرچم کشا ہوئی تو عثمانی خلافت کا سکوت اور عرب ملکوں کے حصے بخرے اس ذہن کے لئے مہمیز ثابت ہوئے۔ اسلامیت اور وطنیت کے ملے جلے جذبات نے ۱۸۵۷ء کے بعد ۱۹۱۹ء میں آزادی کا ایک ایسا ولولہ پیدا کیا کہ ذہنی طور پر انگریز سارے ملک کے دماغوں اور دلوں سے نکل گیا۔ رہا تو ان لوگوں کے دلوں میں جو انگریزی بساط کے مہروں کی حیثیت رکھتے اور اپنے گرد و پیش انسانوں کی ایک اقلیتی کھیپ کے وفاداری بشرط استواری کے تحت سودا گر تھے۔

انگریزی حکومت کے دبدبے نے ۱۸۵۷ء کے بعد اس برصغیر کو نہ صرف مفتوح کر لیا بلکہ مغلوب لوگوں کے ساتھ مرعوب دماغوں کا بازار بھی رونق پر تھا۔ مگر تحریک لاتعاون کے برگ و بار نے مسلمانوں کی عنان رہنمائی دفعتہً ان لوگوں کے حوالے کر دی جنہیں قدرت نے شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، اور نطق اعرابی دے کر پیدا کیا تھا اور جن میں اکثر ماضی مرحوم کے خلوت خانۂ تخیل میں زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔

سید عطاء اللہ شاہ اسی ماضی کا تخیلی پیکر تھے۔ ان کا ہر وار ایک بانکے پکیت کی طرح چوکس رہا۔ وہ کبھی نہ تھکنے والی روح لے کر آئے تھے آج چونکہ دنیا بہت آگے نکل چکی ہے اور اس عہد کی اداشناس پود بھی قریب قریب ختم ہو چکی یا ہو رہی ہے پھر قلم و زبان کے نئے نئے رستم و اسفند یار پیدا ہو رہے ہیں۔ لہٰذا یہ سمجھنا یا سمجھانا ذرا مشکل ہے کہ ان لوگوں نے ملک و قوم کو کیا کچھ عطا کیا؟

صبح ضرور ہوتی ہے اور سورج بھی وقت پر نکلتا ہے۔ لیکن طلوع و غروب کا فاصلہ یونہی طے نہیں ہوتا پہلے ستارے اجڑتے، رات کٹتی پھر پو پھٹتی ہے۔ اس حقیقت کو جاننا اور پہچاننا اشد ضروری ہے کہ قومی آزادی تاریخی اعتبار سے کبھی کسی فرد واحد کی تنہا فراست اور تنہا ہمت کا نتیجہ نہیں ہوتی اور نہ اس کا پودا آناً فاناً بار آور ہوتا ہے۔ یہ حکایت ایک طویل عمل اور ایک طویل عہد سے مرتب ہوتی ہے یہ صحیح ہے کہ قومی خواہشوں اور ملکی ولولوں کا مظہر بسا اوقات ایک ہی وجود ہوتا ہے اور عامۃ الناس کے قدم اُس کے قدموں کے ساتھ اٹھنے لگتے ہیں۔ لیکن اصلاً حریت و استقلال کا یہ قصر بے شمار لوگوں کی جگر کاری، سر فروشی اور فراست و دانائی سے اٹھتا اور بنتا ہے۔

مثلاً بھوک ہے۔ اس کے تقاضا پر انسان روٹی کھاتا ہے۔ لیکن بھوک پہلے لقمہ سے نہیں مٹتی۔ بلکہ یکے بعد دیگرے بہت سے لقمے کھانا پڑتے ہیں۔ آخر میں ایک لقمہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھوک نہیں رہتی۔ ظاہر ہے کہ یہ آخری لقمہ ہی بھوک کا مداوا نہیں ہوتا بلکہ پہلے لقمہ سے لے کر آخری لقمہ تک جتنے لقمے بھی پیٹ میں جاتے ہیں ان کی اجتماعی طاقت سے پیٹ بھرتا ہے۔ بعینہٖ یہی مثال آزادی کی ہے۔ کہ یہ عمارت سنگ و خشت کی نہیں ہوتی لیکن سنگ و خشت سے بنی ہوئی عمارتوں ہی کے اصول اس پر عائد ہوتے ہیں۔ بنیادیں کھودنے بنیادیں بھرنے، دیواریں اٹھانے، اینٹیں لگانے، گارا بنانے اور رنگ و روغن کرنے کے بیسیوں مرحلے پیش آتے ہیں تب ایک عمارت کھڑی ہوتی ہے۔

شاہ جی بیالیس سال قبل جس ہراول دستے کے ساتھ نکلے تھے وہ لازماً قومی آزادی اور قومی استقلال کی

جدوجہد کا مقدمتہ الجیش تھا۔ ان کے سامنے صرف آخری مرحلہ ہی نہ تھا بلکہ وہ ابتدائی مرحلے میں تھے اور اس مرحلے کو پیدا کرنا بھی ان کے ذمہ تھا۔ انہوں نے بنجر زمینوں میں ہل جوتا انہیں ہموار کیا۔ پھر بیج بویا، کھیت سینچا، موافق موسم کی نگہداشت کی، مخالف موسم کے تاؤ سے، آخر فصل پکی۔ اب کیا ضروری تھا کہ بجائی کرنے والے ہی کٹائی کے وقت موجود ہوتے۔ قافلہ چلتا اور بڑھتا رہا حتیٰ کہ منزل سامنے آگئی اور ہم آزاد ہو گئے۔ اب نصف صدی پیچھے مڑ کر دیکھیں تو ان بنجر زمینوں کو سیراب کرنے کی مشکلات کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے!

غرض پاکستان اور ہندوستان کا کوئی گوشہ ہو گا جہاں شاہ جی کی آواز نہ گونجی ہو۔ ان کی آواز کا علم ہر کہیں لہراتا رہا ہے۔ برصغیر کے ایک عظیم رہنما کا قول ہے کہ یہاں کا چپہ چپہ شاہ جی کے جہد آشنا قدموں کا شکر گزار ہے مگر مغربی پاکستان چونکہ ان کا مسکن اور ان کے بزرگوں کا مولد رہا اس لئے مرحوم دلی سے لے کر مرحوم پنجاب کے دور افتادہ علاقوں ہی کو انہوں نے اپنی نوا پیرائیوں کے لئے منتخب کیا اور یہیں اکثر و بیشتر انگریزی حکومت کے مختلف الاصل قلعوں کو مسمار کرتے رہے۔ پنجاب اور اس طرف کے علاقے ایک خاص عسکری ضرورت کے تحت برطانوی سامراج کا بازوئے شمشیر زن تھے۔ انگریزوں نے ان علاقوں میں مختلف مفاداتی کی پخت و پز کر کے یہاں کبھی سیاسی شعور اور قومی آزادی کے ولولوں کو بڑھنے یا پنپنے نہ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک ہم اس علاقے کی صحیح صحیح سیاسی معاشی اور معاشرتی صورت حال سے واقف نہ ہوں اس وقت تک ہم ان محرکات کو جاننے سے قاصر رہیں گے جن کا منطقی نتیجہ ہماری قومی آزادی کا وجود ہے۔ یا جس معنوی طاقت کی اساس پر یہ ہماری عمارت کھڑی ہے۔

حالت یہ تھی کہ آنجہانی ہندوستان میں مرحوم پنجاب ہی ایک ایسا صوبہ تھا جہاں انگریزی مفادات کی بوقلمونیاں مضبوط بنیادوں پر قائم تھیں اور انگریز کسی حالت میں بھی یہ گوارا نہ کرتا تھا کہ اس صوبے کے لوگوں میں حریت خواہی کا جذبہ پیدا ہو۔ اس مقصد کے لئے اس نے پنجاب کے تین فرقوں یا قوموں (ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں) کو مفادات کے خانوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ہندوستان کا مسئلہ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کا مسئلہ تھا تو پنجاب میں یہ مسئلہ سکھوں کی موجودگی کے باعث سہ رخا تھا۔ اور تینوں کے معاشی و معاشرتی مفادات کچھ اس طرح بٹ گئے تھے کہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہونا ہی انکا سب سے بڑا کمال تھا۔ پھر چونکہ ہندوستان کی حکومت انگریزوں نے مسلمانوں سے لی تھی۔ اس لئے ان کا ذہن ۱۸۵۷ء کی بغاوت اور بعد کے اثرات سے منتقمانہ ہو چکا تھا۔ علماء کے خلاف جنگ انبیلا (۱۸۶۳ء) کے بعد خان عزن خان کی تھہری پر جو پانچ مقدمہ ہائے سازش انبالہ (۱۸۶۴ء) پٹنہ (۱۸۶۵ء) راج محل (۱۸۷۰ء) بالوہ (۱۸۷۰ء) اور پٹنہ (۱۸۷۱ء) قائم کئے گئے۔ ان کے عمیق مطالعہ سے انگریز نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے معاملہ میں خوفزدہ ہو چکے تھے بلکہ وہ نہیں مختلف واسطوں سے زیر کرنے کی فکر میں تھے۔

اس ضمن میں تاریخ کا یہ افسوسناک پہلو ہے کہ مرحوم پنجاب نہ صرف ان کا سب سے بڑا معاون ہو گیا بلکہ بہت سے راستے ان کے حق میں ہموار ہوتے چلے گئے۔ خود مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ ان کا سواد اعظم ان مٹھی بھر مسلمانوں کے قبضہ قدرت میں تھا جو برطانوی امپریلزم کے شعوری یا غیر شعوری طور پر فرستادہ تھے حتیٰ کہ

برطانوی شاطروں نے خود مسلمانوں ہی کے ہاتھوں مذہب کی ان بنیادوں کو اکھڑوانا چاہا اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گئے جن بنیادوں پر برطانوی ملوکیت کے خلاف جدوجہد کا قلعہ ایستادہ تھا۔ ایک بڑا ہی دردناک سانحہ ہے کہ علمائے حق کے خلاف یہیں سے فتوے جاری ہوئے۔ جہاد کی تنسیخ کا الہام (مرزا غلام احمد قادیانی) بھی یہیں تصنیف کیا گیا۔ دنیائے اسلام کے خلاف تعویذوں کا انبار بھی یہیں تیار ہوتا رہا اور خلافتِ عثمانیہ کی شکست پر اس صوبے ہی کے خانہ زادوں نے چراغاں کیا۔

اب غور کیجئے جو صوبہ برطانوی ملوکیت کے لئے ریڑھ کی ہڈی ہو جہاں کے لوگ تین قومی دائروں میں مختلف و متصادم مفاد رکھتے ہوں اور مفادان کے لئے موت و حیات کا مسئلہ ہو حتیٰ کہ قومی بیداری یا ملی استقلال کے راستے میں سب سے بڑی روک خود مسلمانوں کی معاشی اور دینی گدیوں کا وجود ہو۔ اور پست ہمتی کے پہلو بہ پہلو دینی گمراہیاں ان کے خون میں سرایت کر چکی ہوں۔ اس فضا میں شاہ جی کا نعرۂ جہاد بلاشبہ قدرت کے انعامات میں سے تھا اور ان کا وجود آیات من اللہ۔ اس کی تفصیل بیان کرنے کا یہ محل نہیں لیکن اس تاریک دور میں مولانا ظفر علی خاں کا "زمیندار" و "ستارۂ صبح" اور دو چار برس کے فاصلے سے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی خطابت اور ایک خاص موڑ پر ان کے ہمنواؤں کی جماعت ایسی بے مثال طاقت اور گراں بہا سرمایہ ہیں کہ تاریخ کا اعتراف کئے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔

ادھر یہ بات بڑے زور سے کہی گئی ہے کہ شاہ جی اردو کے سب سے بڑے خطیب تھے۔ ان کے بیان میں جادو اور ان کی زبان میں سحر تھا۔ ان کے حرف حرف پر لوگ سر دھنتے اور موتی چنتے تھے۔ ان کے خدا، رسول اور اسلام سے عشق کی حکایتیں بھی زبان زد عام ہیں اور لوگ مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ مگر ان کی خطابت نے جن بتوں کو توڑا اور ان کی فراست نے جن فوجوں کو پسپا کیا ان کا ذکر پس منظر میں چلا گیا ہے۔ حالانکہ دوسری اہم چیزیں پس منظر کی تھیں۔ ان کا سب سے بڑا کمال ہی یہ تھا کہ انہوں نے ملک کے جمود کو توڑا اور قوم کی سیاست میں مردانگی کا جوہر پیدا کیا۔ فی الجملہ ان کا وجود منعمات میں سے تھا۔ اپنے پورے ملک میں وہ اپنی ہمہ گیر خوبیوں کے باعث ایک عہد اور ایک ادارہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ قیادت و سیادت اور خطابت و سیاست کی ایک انجمن تھے۔ شاید ہی کوئی ایک شخص ان خصائص کے اعتبار سے ان کا ہمسر ہو۔ انہوں نے پچاس سال کا عرصہ صلہ و اجر کی ہر خفی و جلی خواہش کے بغیر بسر کیا اور یہ شرف صرف انہی کو حاصل رہا کہ:

۱۔ اس برصغیر میں ان کی آواز کا جادو سحر کرتا رہا اور خلاف سامراج ذہن نے ان کے آتش کدے سے نشو و نما کی حرارت پائی۔

۲۔ مسلمان نوجوانوں میں برطانوی ملوکیت سے وابستہ رہنے کا جذبہ ایک عرصہ سے راہ پا رہا تھا۔ انہوں نے اس جذبے کو بیخ و بن سے اکھاڑا۔ جن نوجوانوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا وہ زیادہ تر درمیانے طبقے کے لوگ تھے جن سے عوامی تحریکوں میں لیڈر شپ پیدا ہوتی ہے۔

۳۔ غریبوں کی ایک ایسی جماعت (مجلس احرار اسلام) تیار کی جو امراء کے استحصالات سے برافروختہ ہو

کر نہ صرف طبقاتی شعور کی راہ پر آگئی بلکہ بازار سیاست ۔کے معرکہ ہائے خرید و فروخت سے بلند و بالا ہو کر کام کرتی چلی گئی۔

۴۔ مسلمانوں میں فعال سیاسی کارکنوں کا ایک ایسا گروہ پیدا کیا جس کا عام حالات میں قحط تھا۔ اس کیمپ ہی سے اعلیٰ پایہ کے وہ مقرر پیدا ہوئے جنھوں نے انقلابی ذہن کی نقش آرائی میں قابل قدر حصہ لیا۔

۵۔ عوام کے دلوں میں نہ صرف استحصالی گروہ کے خوف کو دور کیا بلکہ ان کے جوہر خودی کو یہاں تک پروان چڑھایا کہ قربانی وایثار کا تاریک راستہ روشن ہو گیا۔

۶۔ مسلمانوں میں جن سیاسی و دینی بدعات کو بالالتزام راسخ کیا جارہا تھا ان کا سانچہ توڑ ڈالا اور بعض معاشرتی خرابیوں کا سد باب کیا۔

۷۔ خطابت میں نئی نئی راہیں پیدا کیں قیادت کے کاسہ لیس ذہن کو ختم کیا۔ سیاست کو امراء کی جیبی گھڑی یا ہاتھ کی چھڑی بننے سے روک دیا اور اس کا ایک عوامی مزاج بنا ڈالا۔ اگر تحقیق کی جائے تو یہ بات بھی نکھر کر سامنے آجائے گی کہ نشو و نما کے اعتبار سے اردو کا دامن ان کی خوبیٔ گفتار کا منت پذیر ہے۔

یہ حقائق اتنے واضح ہیں کہ نصف صدی کے سیاسی شب و روز کا وقائع نگار خود شاہ جی کے سوانح و افکار میں سے تاریخ کی بعض گمشدہ کڑیاں تلاش کر سکتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس فرض سے کون عہدہ برآ ہوتا ہے۔

فرمایا: میں ان سوؤروں کا ریوڑ بھی چرانے کو تیار ہوں جو برٹش امپریلزم کی کھیتی کو ویران کرنا چاہیں۔ میں کچھ نہیں چاہتا۔ ایک فقیر ہوں۔ اپنے نانا کی سنت پر مرمٹنا چاہتا ہوں۔ اور اگر کچھ چاہتا ہوں تو صرف اس ملک سے انگریزوں کا انخلا۔ دو ہی خواہشیں ہیں۔ میری زندگی میں یہ ملک آزاد ہو جائے۔ یا پھر تختہ دار پر لٹکا دیا جاؤں۔ میں ان علماء حق کا پرچم لئے پھرتا ہوں۔ جو ۱۸۵۵ء میں فرنگیوں کی تیغ بے نیام کا شکار ہوئے تھے۔ ربِ ذوالجلال کی قسم مجھے اس کی کچھ پرواہ نہیں کہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔

فرمایا: دنیا میں ایک چیز سے محبت کرتا ہوں اور وہ ہے قرآن! مجھے صرف ایک چیز سے نفرت ہے۔ اور وہ ہے انگریز! میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کے تجربوں اور مشاہدوں نے میرے ان دو جذبوں میں بلا کی شدت اور حرارت پیدا کر دی ہے۔ محبت اور نفرت کے یہ دو زاویے ایسے ہیں کہ جن دماغوں میں ان کا سودا ہو ان کے لئے پابہ زنجیر ہندوستان میں جیل خانہ زندگی کے سفر کا ایک ایسا موڑ ہے۔ جہاں کبھی طلب کے خیال سے رکنا پڑتا ہے کبھی فرض کی کشاکش لے آتی ہے اور کبھی جستجوئے منزل کا تقاضا پہنچا دیتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اب جیل خانے کی آبرو پر بوالہوسوں نے پیش دستی شروع کی ہوئی ہے۔